فکرِ اقبال کی روشنی میں فنونِ لطیفہ کا پاکستانی ثقافت میں مقام

ارشد خانم* ڈاکٹر انوار احمد**

Abstract:

In this article with the title "The Role of Fine Arts in the Embodygyment of Pakistani Culture" in the prospective of thought of Iqbal" Miss Arshad Khanam has elaborated the enlightened and progressive view of Iqbal. In contrast to the perception of fundamentalist who deem fine Arts as agzastic activity of a nation are polity who has last her destination. It deals with the thought process of Iqbal and i.e. consciousness' and discovery of the possibilities of self and esthetic pursuits and individuals and nations.

اقبال ایک روشن فکر مفکر اور تخلیق کار ہیں جو بلاشبہ ذہنی ارتقاء کے لیے مذہبی تجربے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔انہوں نے جو کچھ پڑھا اس سے اپنے عہد کا تجزیہ کیا اور پھر جو کچھ تجویز کیا اُس میں ان کا دردمند دل کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ ایک پیش بین مفکر کی بصیرت کے حامل ہیں اسی لیے اسلام کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو برصغیر کے مسلمانوں اور خصوصاً مسلمانوں تک پہنچانے کی تمنا رکھتے ہیں مگر ہوا یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد اقبال کے افکار بوجوہ جزوی طور پر ہی پیش کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے اقبال کا شعری اور فکری جینئس افغانستان، مصر، ایران، ترکی اور وسط ایشیا یا تحریکِ آزادی میں مصروف انقلابی افراد تک تو پہنچا مگر خود پاکستان میں فکرِ اقبال کی روشن خیالی اور انقلابیت کو گھٹا کر پیش کیا گیا۔

آج ہماری اجتماعی زندگی کو بعض بنیادی سوالوں کا سامنا ہے۔ پہلا یہ کہ تبدل و تہذیب جو تیزی سے ہمارے رہن سہن کو مغربی رہن سہن کے رنگ میں رنگ رہی ہے گویا طاقتوروں کی تخلیق کردہ عالمگیریت کے روبرو تحلیل و معدوم ہونے کے اندیشے سے دوچار ہے، وہاں ہمارے منفرد مذہبی احساس اور جداگانہ اخلاقی اور سماجی اقدار کا کیا مقام ہے؟۔ دوسرا یہ کہ جس معاشرے میں فنونِ لطیف کو فروغ حاصل ہو، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، تھیٹر یا اس سے متعلق سرگرمیاں فروغ پائیں تو کیا وہ معاشرہ گمراہ یا بے راہ رو کہلائے گا؟ تیسرا یہ کہ کیا برصغیر کے فنونِ لطیف سے متعلق ورثے اور روایت میں مذہب کوئی حدِ فاصل قائم کرتا ہے؟

* استاد شعبہ اُردو، گورنمنٹ برائے خواتین، ملتان۔

** صدر شعبہ سرائیکی، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

انہوں نے اپنے تصورات کے قصر کی تعمیر اور افکار کی تشکیل کرتے ہوئے شاعری کو اس خواب کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ اقبال کا پختہ ایمان تھا ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' جب انسان اس معراج کمال تک پہنچ جاتا ہے تو صحیح معنوں میں دنیا میں خدا کا نائب بننے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرد کامل کسی داستان کا کردار نہیں بلکہ تاریخ اسلام کی ایک حقیقت ہے جس نے اپنے قول اور عمل سے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا تھا۔ 'مرد کامل' کی ہستی اقبال کو بہت مرغوب ہے اس میں جلال و جمال کا جو امتزاج ہے وہ حُسن کا لازمی جزو ہے جو فن کو جنم دیتا ہے۔ اقبال کے خیال میں جلال اور جمال کو الگ الگ کر دینے سے حُسن کا تصور نامکمل رہ جاتا ہے، ایسے نامکمل تصور سے کوئی فن پارہ وجود میں نہیں آ سکتا اسی لئے اقبال کے نزدیک مسلمان کو ان دونوں کیفیات کا مجموعہ ہونا چاہیے۔ انسان کی جلالی کیفیات کا تعلق براہِ راست ''انا'' اور ''خودی'' سے ہے جب کہ جمال سراسر حُسن کی ایک صفت ہے اور خود خداوند کریم کی ذات پاک ''حُسن مطلق'' ہے اسی لیے اقبال کے نزدیک جمال واضح طور پر جلال سے بہتر ہے۔

اقبال کی شاعری میں جلال و جمال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے نزدیک مردانہ تفوق کی بنا پر مرد مومن ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہے۔ عورت ایسے مرد مومن کی تخلیق کر سکتی ہے تربیت کر سکتی ہے لیکن اس کی قائم مقام نہیں بن سکتی کیوں کہ صنف نازک مردانہ وقار و تحمل کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔

اقبال نے اپنے کلام میں شعورِ ذات اور تہذیب و ثقافت میں خودی کا جو عنصر شامل کیا ہے اس کی بدولت خدا کی پہچان اور دنیاوی امور میں مومن کے معمولات مربوط ہو گئے ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا جزو اعلیٰ ہے جس کو اقبال نے بڑے احسن طریقے سے پیش کیا اور اسی فلسفہ کی بنا پر مسلمانوں کا مغربی اقوام سے الگ ایک تشخص معرض وجود میں آتا ہے۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قوموں کے ادب و ثقافت میں اقبال قوتِ عمل اور حسن واقعات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ عمل کی راہ چھوڑ کر تخیل پرست ہونے والوں کے لیے ان کے پاس کوئی دادِ تحسین نہیں۔ وہ آرٹ، مذہب اور اخلاقیات سب کو اسی معیار پر پرکھتے ہیں اُن کے نزدیک وہی آرٹ لائق تحسین ہے جس کی بدولت ہماری خودی مستحکم ہو کیوں کہ غلاموں کا فلسفہ اخلاق ہماری خودی کو ضعیف کر دیتا ہے۔ غلام قومیں عاجزی، انکسار اور خاکساری کو گلے لگانے پر مجبور ہوتی ہیں جب کہ انسانی ثقافت کے ذریعے افراد اور اقوام کو اعلیٰ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ اخلاقیات میں جنسی پاکیزگی، انسان دوستی، بلند نظری، حوصلہ مندی اور جرأت رندانہ کا ہونا ضروری ہے جب کہ معیشت میں عدل و انصاف، استقامت اور پیش قدمی کا ہونا لابدی امر ہے۔ اسی طرح ہی انسان کے معاشی اور

سیاسی حقوق کا تحفظ ہوگا، تمام بنی نوعِ انسان کو بہتر معیارِ زندگی میسر آئے گا اور ایک مثالی ثقافت جنم لے گی۔ ایسی ثقافت جس کا عملی نمونہ ملت اسلامیہ کے ماضی میں نظر آتا ہے۔

اقبال مسلم دنیا میں نشاۃ الثانیہ کے آرزومند تھے۔ اُن کا وجدان اور سائنسی شعور انہیں دورِ جدید کے تقاضوں سے باخبر رکھے ہوئے تھا۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ کسی بھی تہذیب کی بنیادی روح اور اجزا کی تشریح کا فریضہ مذہبی پیشواؤں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اُن کے جامد ذہن عوامی یا حرکی جمالیات کے مظاہر کو، نواہی یا ممنوعات ومکروہات بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح تہذیب کا عمل آگے نہیں بڑھ پاتا۔

اقبال نے اپنی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں آرٹ، تاریخ اور فلسفے سے متعلق اپنے نقطہء نظر کو تخلیقی واردات بنا دیا ہے۔ اپنی اس شاہکار نظم میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ زمانے کی چیرہ دستی سے سلطنت، ہنر یا شخصیت کوئی بھی چیز محفوظ نہیں رہتی لیکن آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس کی تعمیر اس پرانی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، جو مسلمانوں کے روشن ماضی کو ایک واہمہ نہیں رہنے دیتی۔ بالفاظ دیگر ہسپانیہ میں اب بظاہر مسلمان نہیں رہے، یا وہ اپنے وجود کا برملا اظہار وہاں نہیں کر سکتے لیکن ان کی تہذیب کی روح مسجد قرطبہ کی شکل میں موجود ہے اور ایک جلیل القدر، قوم کی جفاکشی، جانبازی، مہم جوئی اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے۔ علاوہ ازیں حکمرانوں کے سماجی عدل اور صناعی یا نقاشی سے ان کی دلچسپی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اقبال نے اس لافانی نظم کے ذریعے بظاہر ایک عمارت کو ملت کے فکری اور ثقافتی ورثے کی بنیاد بنا دیا ہے اور ملت وعمارت کی مرکب تصویر کو تاریخ کے فریم میں فٹ کر کے ماضی، حال و مستقبل اور ایمان وعشق کے تصورات کے تحت ازل سے ابد تک پھیلے زمان کا احاطہ کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ دین اور فن کو ہم آہنگ کرنے کی بنا پر ہوا ہے۔ اس سے دین کا نام بلند اور فن لازوال ہو گیا۔ اس میں جلال و جمال کی وہ آمیزش نظر آتی ہے جو اقبال کو بہت مرغوب ہے۔ اقبال کے نزدیک ''لا الہ الا'' جلال و جمال کا منبع ہے۔ لا الہ سے جلال اور الا اللہ سے جمال پیدا ہوتا ہے۔ اپنی شاعری میں اقبال چاند کو جمال اور سورج کو جلال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چاند سکون اور طمانیت کا باعث ہے جب کہ سورج کی تپش اور حدت کارگہہ حیات میں کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ یہ حدت اور تپش جب سوز کا روپ دھار لے تو اقبال کی وہ شاعری جنم لیتی ہے جس نے اپنے سوزِ دروں سے برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیا۔

ایسی ہی تاثیر، جوش اور سوز اقبال دیگر فنونِ لطیف میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بالِ جبریل کی نظم ''سینما'' ہو یا ضربِ کلیم کی ''تیاتر''، ہر جگہ ایک ہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ ایسا فن جس میں اپنی اصل شخصیت کو پس پشت ڈال کر

کسی دوسرے چہرے کا نقاب اوڑھ لیا جائے کسی کام کا نہیں کیونکہ اس سے ''انا'' یا ''خودی'' مجروح ہوتی ہے اور کوئی بھی فن جب تعمیر خودی سے عاری ہو تو کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ضربِ کلیم میں ''ادبیات فنونِ لطیفہ'' کی ذیل میں لکھے جانے والے اشعار میں اقبال نے فنونِ لطیف کے بارے میں کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موسیقی ہو یا شاعری، سیاست ہو یا علم وفن، دین ہو یا آرٹ یہ سب انسانی زندگی کے لیے مدد ومعاون ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے انسانی خودی مستحکم ہو سکے۔

اپنی نظم ''دین و ہنر'' میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ موسیقی ہو یا شاعری، سیاست ہو یا علم وفن، دین ہو یا آرٹ یہ سب فنون انسانی زندگی کے خادم ہیں۔نظم ''تخلیق'' میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نئی دنیا پیدا کرنے کے لیے نئے افکار کی ضرورت ہے کیونکہ نئے افکار سے نیا نظام وجود میں آتا ہے۔نظم ''مصور'' میں اقبال نے یہ واضح کیا ہے کہ حقیقی مصوری وہ ہے جس میں خود مصور کی شخصیت واضح ہوتی ہو ہندوستان کے مصور تخیل کے فقدان کی بنا پر جدتِ فکر کا اظہار نہیں کر پاتے۔ یہاں میں یہ نکتہ بھی بیان کرنا چاہوں گی کہ قرآن کے فرمان کے مطابق خود خدا بھی ''مصور'' ہے۔''**ھو الخالق الباری المصور، له اسما الحسنیٰ** ''اقبال انسان میں یہی صفات خداوندی دیکھنے کے متمنی ہیں تاکہ مصور کی تصویر میں ''حسن ازل'' کی جھلک دیکھی جاسکے۔''سرودحلال''اور''سرودحرام'' کے عنوان سے'ضربِ کلیم' میں شامل دومختصر نظموں میں اقبال نے موسیقی کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں کہ موسیقی کا کام قلب کو خوف اور غم سے پاک کرنا ہے۔دائمی سرور اور ابدی اطمینان عطا کرنا ہے۔ایسی موسیقی مسلمان کو قرآن کی قرأت سے بھی حاصل ہوتی ہے، یہاں مولانا روم سے ان کی فیض کشی کلیدی کردار ادا کرتی ہے، وہ کہتے ہیں، کہ جو نغمہ روح کو جنبش میں لائے، وہ سرودِ حلال اور جو محض تن کو متحرک کرے، وہ سرودِ حرام ہے۔۔اپنی نظم ''رقص'' میں بھی اقبال نے رقص کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔رقص جان اور رقص تن۔اقبال رقص تن کے قائل ہیں کہ اس طرح مقامات بلند پر پہنچ کر انسان ٹھہر نہیں جاتا بلکہ سرشاری کی یہ کیفیت اُسے مزید آگے بڑھنے پر اُکساتی ہے اور اسی میں دینِ اسلام کی حقیقت پوشیدہ ہے۔زبورِ عجم میں ''بندگی نامہ'' کے عنوان سے ''در بیان فنون لطیفہ غلاماں'' کے تحت موسیقی اور مصوری پر اقبال نے براہِ راست کھل کر بحث کی ہے۔غلامی کے بارے میں اُن کا موقف بہت واضح ہے وہ کہتے ہیں کہ غلامی دل اور روح کی ہلاکت کا نام ہے۔یہ افراد اور اقوام کو شباب سے محروم کر دیتی ہے۔اس کی وجہ سے ملّت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔غلاموں کے فنون چونکہ غلامی کی حالت میں پروان چڑھتے ہیں اسی لیے ان کے نغموں میں گرمی اور سوز نہیں ہوتا۔غلاموں کی تخلیق بے عمل اور موت کی نوا ہے۔ان کے فنون ایسی افسردگی پیدا

کرتے ہیں جو فنا یا موت کا درس دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اقبال کے نزدیک سوز وغم فن کا ایک جوہر بھی ہے جو فنکار کی روح کو بیدا کرتا ہے پھر فنکار کے اندر فن کی وہ دولت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے لذت تحقیق سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک جہانِ دیگر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ

غم دو قسم است اے برادر گوش کن
شعلۂ مارا چراغِ ہوش کن
یک غم است آن غم کہ آدم را خورد
آن غم دیگر کہ ہر غم را خورد

(زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال فارسی، ص۴۶۲)

گویا تخلیق کار اپنے نفسی مسائل کی بجائے انسانیت کے غم کو ذاتی غم پر ترجیح دے کر فن کو امر بنا سکتا ہے، یہی اس کا ترفع یا ارتفاع کا عمل بھی ہے اور تہذیبِ فکر کا بھی۔ ''بندگی نامہ'' ہی میں موسیقی کے بعد اقبال نے محکوموں اور غلاموں کی مصوری کا ذکر کیا ہے اور اپنے معاصر مصوروں کی کاوشوں کو غلاموں اور محکوموں کی مصوری کی علامت کے طور پر دیکھا ہے۔ پھر ''مذہب غلاماں'' میں غلام اور محکوم کی مذہبی زندگی کی جھلک دکھاتے ہیں کہ محکوم اپنے ذہن، اخلاق، روحانی شخصیت اور ادراک حقائق سب کو سستے داموں فروخت کر دیتا ہے اسی لیے اس کی زندگی مذہبی واردات سے خالی ہوتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر تو خدا کا نام ہوتا ہے لیکن اس کا اصل قبلہ اس کا آقا اور فرمانروا ہوتا ہے جب کہ مردان آزاد کا فن تعمیر (بندگی نامہ کا آخری باب) کے ضمن میں اقبال نے مسلمانوں کی جمالیاتی روح کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک فنِ تعمیر ایک ایسا فن ہے جس میں اسلامی تمدن کی روح سمٹ آتی ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے شیر شاہ سوری اور قطب الدین ایبک کے کارناموں کا حوالہ دیا ہے۔ ایبک کے کارنامے سے مراد دہلی کی مسجد قوت الاسلام ہے۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کی شاعری باقاعدہ موضوعات کی پابند، اخلاق آموز اور فلسفیانہ تھی۔ انہوں نے سماجی زندگی کی جو اقدار مقرر کیں ان کا مرکز بھی شخصیت ہی کو قرار دیا۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ مثالی فن کار کی روح آرزو کے خالص جوہر یعنی عشق کے ذریعے حرکت میں آتی ہے جب کہ عشق، حُسن اور قوت کا مجموعہ ہے۔ اقبال کا دور انحطاطی رجحانات کا دَور تھا جب کہ قدرت نے انہیں عمل پرست فطرت عطا کی تھی۔ وہ اپنی شاعری کو ایک سماجی فریضہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ایک آزاد قوم کے فنون کا مقابلہ غلام قوم کے فنون سے کرتے ہوئے اعلیٰ

نصب العین کی راہیں متعین کرتے ہیں تا کہ قوم میں اجتماعی تبدیلی لائی جا سکے۔

اقبال زندگی اور فن میں ربط باہمی پیدا کر کے حصولِ منزل کو پیش نظر رکھتے ہیں تا کہ فرد اور معاشرہ کو فن کے ذریعے پستی سے بلندی کی طرف لے جائیں۔ انسان دوستی کے اس خیال کو اقبال نے عمل سے ہم آہنگ کر کے انسانیت کے لیے جولاں گاہ بنا دیا ہے۔ پھر انسانی زندگی کے لیے جو لائحہ عمل مرتب کیا ہے وہ ایک الہامی پیغام بن کر ہر جذب آمادہ طبیعت کے لیے فیض رساں بن جاتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظریات نے ان کے ہاں تنگ نظری پیدا نہیں کی بلکہ ان کے شعور کو بیدار کیا ہے اور ان کی معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اقدار میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔ فنونِ لطیف جو کہ ثقافت کی ایک شاخ ہے ان تمام عوامل سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس امر کے متقاضی ہیں کہ انہیں عروج و زوال کی نشانیوں میں دوسرے عوامل کی نسبت خصوصی اہمیت دی جائے اسی لیے اقبال کی ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ فنونِ لطیف انسانی کردار کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کریں۔

اقبال کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ برعظیم پاک و ہند میں رہنے والی مسلم قوم دراصل مختلف ممالک کی تہذیبوں کا وہ ''مغلوبہ'' ہے جس میں عرب، ترک، ایرانی، ہندوستانی اقوام کا ایک کثیر مجموعہ شامل ہے۔ اسی لیے ان کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے وہ اس سلسلے میں ابہام کا شکار ہے۔ اقبال نے ان حالات کا اعادہ کرتے ہوئے نظم و نثر میں عین اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق فنونِ لطیف اور فنونِ مفید کی افادیت کو واضح کیا اور عظمتِ انسانی کا وہ پہلو اُجاگر کیا جو اعلیٰ نصب العین کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

یہی وہ تہذیبی محرکات اور عوامل تھے جن کی بنا پر اقبال نے ایک الگ خطۂ زمین کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جو ع الارض ان کا مطمحِ نظر نہ تھی۔ بحیثیت مسلمان ان کا ایمان تھا کہ خدا کی تمام زمین مسلمان کا گھر ہے جب کہ ہندوستان وہ خطۂ زمین ہے جہاں مختلف اوقات میں مختلف اقوام کا ورود ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین نے ان نو وارد تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نئی طرزِ معاشرت کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ نئی طرزِ معاشرت ایک ایسے نگارخانے کی طلب گار ہے جس میں تمام اسلامی فنون کے مرقعے جدید رنگ میں رنگے ہوئے نظر آسکیں۔ اور یہ نظریہ اسلامی عقائد پر ہی مبنی ہے جب کہ اسلامی عقائد کا اپنا کوئی کلچر نہیں اسی لیے آج یہاں مغرب کی تقلید کا رواج عام ہو گیا ہے اور ہمارا کلچر مغربی کلچر میں مدغم ہوتا چلا جا رہا ہے اس طرح انفرادی یا اجتماعی بدمذاقی کو کلچر کا نام دے کر فنونِ لطیف کے مترادف سمجھا جا رہا ہے۔ مسائل پیدا کرنے والے ہماری کمزوریوں سے واقف ہیں وہ وقفے وقفے

سے اپنی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں اس طرح ردِعمل کی شدت سے بچ کر اپنے تہذیبی نمونوں کو ہماری معاشرتی زندگی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

پچھلے پچاس برسوں میں مشرق سے مغرب کی جانب جو نقل مکانی ہوئی ہے اس نے بھی غیر ملکی ثقافتی یلغار کا ایک جواز پیدا کر دیا ہے۔ اس ساری صورتِ حال کو ''اسلام اور عیسائیت کے درمیان ٹکراؤ'' کا نام دیا جا رہا ہے اس ٹکراؤ کو شدید کرنے میں غیر ملکی عالمی تنظیمیں انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور نیٹ ورک نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس بین الاقوامی صورت حال کے تناظر میں جب ہم قیامِ پاکستان کے مقاصد کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ تحریکِ پاکستان دوقومی نظریے پر مبنی مسلم تشخص کے استحکام کے لیے چلائی گئی تھی۔ یہی وہ مقصود و مدعا تھا جس کی وضاحت اقبال نے اپنے خطبے ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کو ربِ کریم نے بنی نوع انسان کی تعلیم اور بھلائی کے لیے تخلیق کیا ہے اسی لیے پیغمبر وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے تاریخ کی تخلیق میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے اور اپنی نفسیاتی توانائی سے دنیا کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہی کام آپ کی تعلیمات نے کیا۔ آپ کی مذہبی واردات نے صحرائے عرب کی ثقافت کو بدل کر رکھ دیا اس کی بدولت ایک توانا اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تھا۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عقل کو بروئے کار لا کر اشیا کا مشاہدہ کریں اور اپنے وجدان کے بل بوتے پر انہیں استعمال کریں جس طرح ایک زمانے میں روم اور یونان کی تہذیبیں مٹ گئی تھیں اسی طرح آج ہم بھی روبہ زوال ہیں۔ یہ فطرت کا عمل ہے جو ہماری بے عملی کی سزا کے طور پر ہم پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ آج ہم یورپ کی نقالی تو کر رہے ہیں لیکن اجتہاد سے کام نہیں لے رہے۔ فنونِ لطیف کے نام سے جن عناصر کو اپنایا جا رہا ہے وہی دراصل ہمارے تہذیبی انحطاط کا باعث ہیں۔ آج دنیا بھر میں مذہب کے نام سے جو فساد برپا ہے اُس کی وجہ سے دنیا مختلف گروہوں میں بٹ گئی ہے جب کہ مسلم ثقافت کی بنیاد انسانی آزادی، انسانی مساوات اور یکساں معاشی مواقع کی ضمانت پر رکھی جانی چاہیے۔ اس کے نتیجے میں ایسی عالمی ثقافت جنم لے سکتی ہے جو انسان کو ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب ایک جامع، ہمہ گیر اور مثالی دستور زندگی مہیا کرتا ہے اور تمام مذاہب مل کر بنی نوع انسان کو کامیابی اور فلاح کی راہ دکھاتے ہیں، انہی کی بدولت انسان تعمیر شخصیت اور فلاحِ انسانیت کے اصولوں پر کاربند رہنا سیکھتا ہے۔

اقبال کا عقیدہ ہے کہ اجتہاد میں شریعت کی تعبیر نو کر کے امن و سلامتی والا معاشرہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں چونکہ ہماری قومی ثقافت اسلام کے بنیادی تصورات پر مبنی ہے اس لیے قدیم و جدید اور علاقائی ثقافتی عناصر کا

تجزیہ ہمیں اپنے قومی تشخص کے اصل سرچشمہ اور منبع قرآن سے حاصل کرنا چاہیے۔

اقبال کے نزدیک مسلمان عالمگیر ہدایت کا داعی ہے۔اس کے اصول وتصورات آفاقی اور ہمہ گیر ہیں اسی لیے اسلامی ثقافت عالمی اور آفاقی عناصر کی حامل ہے۔ یہ تعصب اور تنگ نظری سے بالا وسعت فکری، وسعت نظری اور وسعت قلبی کے اجزا پر مشتمل ہے اسی لیے یہ ثقافت اپنی نظریاتی بنیادوں پر مختلف جگہوں اور مختلف علاقوں میں پروان چڑھ سکتی ہے۔اگر چہ اس میں علاقائی تنوع اور جغرافیائی وسعت پائی جاتی ہے لیکن اپنی اثر پذیری کی بنا پر یہ سرحدوں سے ماورا ہے اسی لیے ''ھدی للناس'' سے مراد ''ہدایت عالم انسانیت'' ہے۔اس نظریے پر پروان چڑھنے والی ثقافت سرحدوں سے نکل کر پوری انسانیت تک پہنچ جاتی ہے۔ تنگ ذہنوں کو کھول دیتی ہے اور کور ذوقوں کو وسعت نظر عطا کر دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال قرآنی وحی کو مقامی یا نسلی یا قومی حیثیت سے بلند تصور کرتے ہیں اور اسے انسانیت کی آفاقی ملکیت قرار دیتے ہیں۔

اسلام نے دین اور روایت میں فرق روا رکھا ہے۔ جب دین اور روایت میں فرق باقی نہ رہے تو دین محض روایت بن کر رہ جاتا ہے اور روایت جمود تقلید اور تعطل کی طرف رغبت دلاتی ہے جب کہ دین خالص اجتہاد، تخلیق اور مسلسل تعمیر پر آمادہ کرتا ہے۔اسی اصول کی روشنی میں مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج کے زمانے میں تخلیقی ثقافت کو فروغ دیا اور جہاں کہیں جاندار تعمیری ثقافتی ورثہ میسر آیا اسے اپنا لیا تھا۔

اسلامی ثقافت کی تشکیل میں ہدایت کے اس عنصر کو اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ ہدایت کا تعلق محض تعلیم سے نہیں ہے بلکہ یہ جملہ تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں اور قوتوں کے اظہار سے حاصل ہوتی ہے۔صحت مند تفریح ہدایت کی قوتوں کو جلا بخشتی اور ان میں تحریک پیدا کرتی ہے۔جسم وذہن کی تربیت کے صحت مند ذرائع (فنونِ لطیف) کا شمار بھی اس میں ہوتا ہے۔

سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے اس دَور میں مذہب کے سامنے بنیادی سوال ہی یہ ہے کہ سائنس اور تکنیکی نظریات کی روشنی میں مذہب کے پاس عالمی اور آفاقی سطح پر ہدایت موجود ہے یا نہیں۔ مذہب اور سائنس کے اس معرکے میں دراصل مسلمانوں کی اجتہادی صلاحیتوں کا امتحان ہے۔اقبال کے خیال میں اسلام کے بنیادی تصورات میں تو اس بات کا تسلی بخش جواب موجود ہے لیکن ان عالمگیر اور آفاقی تصورات کو عملی شکل دے کر اسلامی ثقافت میں جاری وساری کرنا خالصتاً عہدِ حاضر کے مسلمانوں کا کام ہے۔اقبال کو دکھ ہے کہ آج کے مسلمان کسی طرح بھی اس چیلنج پر پورے نہیں اُتر رہے کیونکہ مختلف اسلامی ممالک کی ثقافت میں دینی اور دنیوی اصولوں کا وہ امتزاج نظر نہیں

آتا جس کا اسلام خواہاں ہے۔اسی لیے آج کے جدید سائنسی اور تکنیکی دَور میں دنیا منتظر ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس ایسی ثقافت موجود ہے تو وہ اسے پیش کریں تا کہ دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔

ماخذات

۱۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک ''اقبال اور ثقافت''، اقبال اکیڈمی پاکستان، طبع اول، جنوری ۱۹۸۶، ص ۱۸۔

۲۔ ایس ایم یوسف، ڈاکٹر، ''اسلامی کلچر''، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء، ص ۱۔

۳۔ تاراچند، ''تمدن ہند پر اسلامی اثرات''، ترجمہ محمد مسعود احمد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶۔

۴۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، سبط حسن، دانیال کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۹۔

۵۔ کے۔ایس۔لال، ''ارلی مسلمز اِن انڈیا'' (انگریزی)، اقبال پبلی کیشنز، لاہور، سنہ ندارد، ص ۵۵۔

۶۔ ایشوری پرشاد، ''تاریخ مسلم حکمران'' (انگریزی)، ص ۱۳۲، مطبع ندارد سنہ ندارد۔

۷۔ پروفیسر عزیز احمد، ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، طبع دوم، ۱۹۹۷، ص ۴۵-۴۶۔

۸۔ سید حسن ریاض، ''پاکستان ناگزیر تھا''، شعبہ تصنیف و تالیف، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۵۴-۲۵۵۔

۹۔ اقبال کا نظامِ فن، ڈاکٹر عبدالمغنی، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول ۱۹۸۵ء۔

۱۰۔ محمود نظامی، ''ملفوظاتِ اقبال''، اشاعت منزل بل روڈ، لاہور، س۔ن، ص ۲۱۰۔

۱۱۔ پروفیسر این میری شمل، ''شہپر جبریل''، مترجم ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلشرز، اُردو بازار، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۔

۱۲۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، ''جمالیات''، ص ۵۵، مجلس ترقی ادب، لاہور، اگست ۱۹۵۴ء۔

۱۳۔ مظفر حسین برنی، ''کلیات مکاتیب اقبال'' (جلد سوم) اُردو اکادمی، دہلی، ص ۳۰۹۔

۱۴۔ گوپی چند نارنگ: ''اقبال کا فن''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۱ء

۱۵۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ''مضمون اقبال کے جمالیاتی افکار''، ص ۵۰۸، اقبالیات کے سو سال، اکادمی ادبیات پاکستان، طبع اول، ۲۰۰۲ء۔